"اپنے لدھیانے مہنت بھی تو بڑا قابل ہے۔" جوالا سنگھ نے چڑ کر کہا۔

"اس میں کچھ نہیں سردار جی۔" ہر بھجن کور نے کھلے ہاتھ کی ڈگڈی بجا کر کہا "جس میں دین دھرم کا گیان ہو وہ عورتوں کو نہیں تاڑا کرتا۔"

جوالا سنگھ شرمندہ سا ہو کر خاموش ہو گیا تو ہر بھجن کور پھر ماضی میں پہنچ گئی۔ کہنے لگی "جس طرح گورو مہاراج کی تصویر میں ان کی آنکھیں ہیں اسی طرح کی گیانی بھائی بابلی سنگھ آنکھیں ہیں' جیسی پگڑی گورو مہاراج کے سر پر ہے ویسی بھائی بابلی سنگھ کی ہوتی ہے۔ شبد بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ چلتے ہیں تو ہرے توت کی ٹہنی کی طرح نرم نرم قدم اٹھاتے ہیں۔ رکتے ہیں تو بھگتی سی بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنتے ہیں تو سارا کان تمہاری طرف دے کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔"

جوالا سنگھ نے ہنس کر کہا "ارے کوئی میری شکایتیں تو نہیں کرتی رہی ان سے۔"

ہر بھجن کور نے جوالا سنگھ کی بات سنی ان سنی کر کے مجھ سے پوچھا "ویر جی آپ ان سے کبھی نہیں ملے؟ ملے تو ضرور ہوں گے' تخت پور تو چھوٹا سا شہر ہے۔"

میں نے کہا "میں تخت پور زیادہ دیر نہیں رہا۔ پڑھائی کے سلسلے میں لاہور آ گیا تھا۔ انہیں دیکھا ضرور ہو گا' لیکن پہچانتا نہیں۔"

جوالا سنگھ نے کہا "سواری رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں' سفید قمیص شلوار' کچے ریشم کی بنڈی' پیروں میں کالی گرگابی' انگلیوں میں چاندی کے چھوپے۔"

"کالی سیاہ چھوٹی ڈاڑھی۔" ہر بھجن کور نے کہا "اور بالکل گول جوڑا جو پگڑی کے اندر بھی ڈلکیں مارتا ہے۔ گردن پر کیسوں کے چھوٹے موٹے تھوڑے تھوڑے بال' پوتر تا کا مان اور نور سروپ کی آن۔ گورباتی کے شبد پڑھتے ہیں تو ایسے لگتا ہے گورو مہاراج خود بول رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا "وہیں رہتے ہیں دربار صاحب میں؟" تو ہر بھجن نے سر ہلا کر کہا "بازار میں ایک چھوٹا سا چوبارہ ہے' نیچے بساطی کی دکان ہے' تنگ سی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ وہاں رہتے ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟" جوالا سنگھ نے ناراض ہو کر پوچھا۔

"بتانا کس نے تھا۔ مجھے آپ معلوم ہے۔ ترنتارن سے میلے پر پانچ پیاریاں آئی تھیں' وہ ان کے درشن کرنے چوبارے پر گئیں تو میں بھی ساتھ چلی گئی۔"

WWW.PAKS

"تم نے مجھے پہلے تو کبھی نہیں بتایا۔" جوالا سنگھ بدستور ناراض تھا۔

"بتانے والی کوئی بات ہی نہیں تھی سردار جی۔" ہر بھجن کور نے کہا "پانچ پیاریوں نے صلاح بنائی تو میں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ نگلے منجے پر بیٹھے جپ جی صاحب پڑھ رہے تھے۔ ہم ساریاں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں تو "نہ بھئی نہ بھئی" کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ہمیں ہاتھ جوڑنے سے منع کر دیا۔"

"وہ کیوں؟" جوالا سنگھ نے غصے سے پوچھا۔

"کہنے لگے ہاتھ صرف واہگورو اکال پرکھ کے آگے جوڑے جاتے ہیں منکھ کے سامنے نہیں۔"

میں نے کہا میں نے بساطی کی دکان دیکھی ہوئی ہے اور اس کے اوپر والا چوبارہ بھی لیکن میں اس میں کبھی گیا نہیں۔ ہر بھجن نے کہا "ویر جی! اگر آپ ایک مرتبہ اوپر چلے جاتے اور ان کے درشن کر لیتے تو پھر جیون بھر انہی کے ہو کر رہ جاتے۔"

جوالا سنگھ اپنی بیوی سے ایک غیر مرد کی اس قدر تعریف سن کر تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے بات بدل کر بولا "بھلا جی پرسوں ہم نے بمبئی چلے جانا ہے' آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو سکے گی؟" میں نے کہا "کیوں نہیں جوالا سنگھ' جب تک تم لوگ یہاں ہو روز ملاقات ہو گی اور روز باتیں ہوں گی۔ اس دیس میں اپنے لوگ بار بار کہاں ملتے ہیں۔ میں دو دن کی چھٹی لے لوں گا اور تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔"

ہر بھجن نے کہا "ویر جی مجھے تو آپ میں بھی گیانی بھائی باہلی سنگھ کا روپ نظر آتا ہے۔ پر ان کا سروپ نوری ہے اور ہمارا آپ کا خاکی ہے' مٹی رنگا۔"

جوالا سنگھ نے کہا "بس بھی کر۔ اب چھوڑ بھی بھائی باہلی سنگھ کی کھلوی۔ پتہ نہیں بے چارہ کیسا ہے کیسا نہیں' اس کو خواہ مخواہ دیوتا بنائی جا رہی ہے۔"

ہر بھجن کور خاموش ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد بولی "ویر جی میرا سینڈل گنڈھوا دو گے۔ منٹ منٹ بعد کھل جاتا ہے۔" میں ان کو ایک موچی کی دکان پر لے گیا جو گھوڑوں کے ساز تیار کرتا تھا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ یہ لوگ انڈیا سے آئے ہیں اور اس بی بی کی جوتی کو ٹانکے لگانے ہیں تو اس نے جوالا سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"فقیر فقیر!"

میں نے کہا "ہاں فقیر!"

OCIETY.COM

کہنے لگا "یہ ہوا میں اڑ سکتا ہے؟"

میں نے کہا "اس وقت نہیں' جب شام کا وقت ہوتا ہے تو ہوا میں اڑتا ہے اور ساری دنیا کا چکر لگا کر آدھ گھنٹے میں واپس آ جاتا ہے۔"

اس نے آواز دے کر اندر سے اپنی بیوی کو بلایا اور جوالا سنگھ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "انڈین فقیر! ہوا میں اڑ سکتا ہے اور ساری دنیا کا چکر لگا لیتا ہے۔"

اس کی بیوی نے محبت بھری نظروں سے ہر بھجن کی طرف دیکھا اور اس کے سراپا کی تعریف کرنے لگی۔

سینڈل گنٹھوا کر جب ہم وہاں سے چلے تو جوالا سنگھ نے پوچھا "بھاپاجی موچی کیا کہتا تھا؟" تو نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "ہر بھجن کی سندرتا کی تعریف کر رہا تھا۔"

جوالا سنگھ نے طیش میں آ کر کہا "وہ سالا لگتا ہے کسی کی گھر والی کی تعریف کرنے والا۔ آپ نے اس کا منہ توڑنا تھا' نہیں تو مجھ کو بتاتے میں خود کر لیتا۔ اس سے دو دو ہاتھ۔ پھر اس نے بہن کی گالی دے کر کہا "ذات کا موچی اور سرداروں کی عورتوں کو تاڑتا ہے ماں کا یار!"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اوئے یہ یہاں کے لوگوں کا وہار ہے کسی کی صفت ثنا کرنا۔"

"چنگا وہار ہے۔" اس نے جوش میں آ کر کہا۔ میں سالے کو واپس جا کر سدھ کرتا ہوں۔ آیندہ کے لیے نصیحت ہو جائے گی۔" میں نے بڑی مشکل سے جوالا سنگھ کو روکا نہیں تو اس نے بکھیڑا ڈال دینا تھا۔

اگلے روز جب میں ان کے ہوٹل گیا تو ہر بھجن کور اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر جلدی سے بولی "سردار جی اپنے ناشتے کے لیے باہر سے کوئی چیز لانے گئے ہیں۔ ان کو سربہ' توس' انڈا پسند نہیں' بازار سے اپنے لیے کوئی چیز پسند کرنے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں اس کے پیچھے جا کر تلاش کرتا ہوں۔ وہ دکاندار کو کس زبان میں سمجھائے گا۔"

ہر بھجن نے کہا "کوئی بات نہیں' وہ کر لیں گے کچھ بندوبست۔ جب تک وہ نہیں آتے ہم بھائی بابلی سنگھ کی باتیں کرتے ہیں' کیونکہ ان کے سامنے تو یہ بات کھل کر نہیں ہو سکتی۔"

میں نے کہا "تم کو گیانی جی اتنے ہی پسند آ گئے ہیں کہ تم ان کے علاوہ اور کوئی بات ہی

نہیں کرنا چاہتی ہو۔"

کہنے لگی "ان کی بات کے علاوہ اور کوئی بات ہو بھی نہیں سکتی' ان کی شکتی ہی ایسی ہے۔"

میں نے ایک بڑے بھائی کی طرح امت کر کے اس سے پوچھا "بی بی ہر بھجن کور تو اس سے پریم کرنے تو نہیں لگ گئی دھی رانی۔"

میری بات سنتے ہی اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ چہرہ اوپر اٹھا کر بولی "ایسے میرے بھاگ کہاں ویر جی۔ وہ تو آنکھ اٹھا کر بھی تمہیں کی طرف نہیں دیکھتے۔ واہگورو سے ہی لو لگا کر رکھتے ہیں۔"

اس بات کا کوئی خاص جواب ہی نہ بنتا تھا' اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ ہر بھجن نے جوالا سنگھ والی خالی پیالی میں میرے لیے چائے بناتے ہوئے کہا "میں نے پتہ کیا تھا ویر جی' جب وہ مسلمان تھے اور مونے تھے تو باھموں کی ایک لڑکی ان پر عاشق ہو گئی تھی۔ پھر اس کے گھر والوں کو پتہ چل گیا تو انہوں نے اس کا بیاہ بھاگسر کے باھموں میں کر دیا۔ پر وہ اپنے گھر آباد نہیں ہو سکی' جھگڑا کر کے واپس تخت پور آ گئی۔ میں اس بھاگیہ وان کے درشن کرنے دو دفعہ اس کے گھر گئی۔ وہ مجھ سے ملی ہی نہیں۔ انکاری ہو گئی اندر سے ہی جواب دے دیا کہ میں کسی کو نہیں جانتی' کسی سے نہیں ملتی۔"

ہر بھجن کور نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور توس پر جام لگانے لگی۔ اگر مجھے جوالا سنگھ کے اچانک آ جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ہر بھجن کو گلے سے لگا کر ضرور کہتا کہ وہ ظالم تمہیں کی طرف آنکھ اٹھا کر ہی نہیں دیکھتا' مردوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ میں بھی اس کے ہجر کا مارا ہوں ہوں۔ پر میں تیری طرح روتا نہیں!

جب مجھے ہر بھجن کے ساتھ اس کے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو میں نے جوالا سنگھ کے خوف سے کمرے کا دروازہ پورا کھول کر اس کے آگے کرسی لگا دی۔ گیلری میں ٹاکی مارنے والی سینوریٹا ہمیں دیکھ کر دروازے میں آ گئی اور وائیر کے ڈنڈے پر ٹھوڑی رکھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ ہماری گفتگو کے دوران ہر بھجن نے اپنے پرس کے پھٹے ہوئے استر کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی اور میری طرف بڑھا کر بولی "یہ گیانی جی کی مورت ہے جو میں سردار جی سے چھپا کر رکھتی ہوں۔"

لکڑی کی ایک پرانی سی کرسی پر میرے استاد' میرے صاحب' میرے سرکار بیٹھے تھے

اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھی بنا کر انہیں گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہی چہرہ' وہی آنکھیں اور وہی ابرو۔ سر پر سختی سے بندھی ہوئی پگڑی جو کیسوں کی وجہ سے ذرا پھولی پھولی سی تھی۔ کالی سیاہ ڈاڑھی جس میں کہیں سفید بالوں کے جوڑے بھی تھے۔ پیتل کے بٹنوں والی بنڈی جس کی اوپر والی جیب میں پرانی وضع کا ایک موٹا سا پین تھا۔ کلائی پر وہی اونچے شیشے والی ویسٹ اینڈ کی گھڑی اور انگلیوں میں چاندی کی موٹی موٹی انگوٹھیاں۔ سینوریتا نے وائپر کے ڈنڈے سے ٹھوڑی اٹھا کر اور سر جھکا کر غور سے تصویر کو دیکھا اور کہنے لگی "سیک! سیک!!"

میں نے کہا "ہاں سکھ!"

ہر بھجن کو تصویر واپس کرتے ہوئے میں نے آہستہ سے کہا "یہ جو گھڑی ان کی کلائی پر بندھی ہے اسے لہنے چوہڑے کا بیٹا پھولا چرا کے لے گیا تھا۔ پورے تین مہینے بعد روتا ہوا آیا اور گھڑی واپس کر کے پاؤں میں گر کر فرش پر ٹکریں مارنے لگا......"

ہر بھجن نے چیخ مار کر کہا "ویر جی آپ ان کو جانتے ہیں؟ گیانی جی کو؟"

جوالا سنگھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اونچی آواز میں بولا "ارے یہ کیوں کھڑی ہے میم اپنے دروازے میں؟"

میں نے کہا "یہ کمرے صاف کرتی ہے اور کمرہ صاف کرنے آئی ہے۔"

جوالا سنگھ سینوریتا کی طرف ہاتھ کے اشارے کر کے کہنے لگا "نو تھینک یو' نو صفائی' نو صفائی...... ضرورت ہوئی تو ہم آپ کر لیں گے۔ یو گو اوئے...... گو اوئے۔"

سینوریتا "او کے" کہہ کر باہر نکل گئی تو جوالا پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا "یار ان نے تو بڑا اچھا ناشتہ کر لیا ہے۔ دہی بھی مل گیا اور ملائی بھی۔ ملائی تو میں نے کھانڈ ڈال کر کھائی پر دہی میں سو کھا ہی رگڑ گیا۔ بڑا ہی سواد آیا۔"

"اور ساتھ کچھ نہیں لیا۔" میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر کہا "ساتھ کچھ نہیں لیا۔ ساتھ لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ملائی ہی روٹی کی طرح سنگھنی تھی۔ تازہ اور نروئی۔ میں نے کہا خالی چلنے دو۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا "بھاپا جی یہاں دودھ دہی بہت سستا ہے۔"

میں نے کہا "دودھ دہی بھی سستا ہے اور پھل بھی بہت سستا ہے۔"

جوالا سنگھ نے پھل کی طرف تو کوئی توجہ نہ دی البتہ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد دودھ دہی کی تعریف ضرور کرتا رہا۔ اس کی گفتگو کے دوران ہر بھجن کو رمچھلی کی طرح تڑپتی

رہی۔ وہ نہ بیٹھ سکتی تھی نہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں چکر بھی نہیں لگا سکتی تھی۔ کبھی پرس کھول کر دیکھتی، کبھی اپنے بیگ کے پاس جا کر اس کی چیزیں سیٹ کرنے لگتی۔ غسل خانے جا کر کلی کرتی۔ پھر سنک میں تھوک کر اوپر سے پانی چلا دیتی۔ واپس اپنی جگہ پر آ کر انگلی سے جام چاٹنے لگتی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوتی اور جا کر بیگ کی چیزوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے لگتی۔

جوالا سنگھ نے کہا "او کیا ہو گیا بھئی تو آرام سے بیٹھتی ہی نہیں۔"

ہر بھجن کور نے کہا "میرا دل گھبرا رہا ہے، بے چینی ہو گئی ہے۔"

جوالا سنگھ ہنس کر بولا "اوئے دیکھنا بھائی کوئی ایسی ویسی گل تو نہیں ہو گئی۔ پردیس کا معاملہ ہے، کہیں کوئی اور ہی مشکل ڈال دیوے۔"

ہر بھجن کور نے قدرے غصے سے کہا "سردار جی آپ کو تو ہر بات میں ٹھٹھا مخول ہی آتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں، دوسری!"

اس وقت سے لے کر بمبئی روانہ ہونے تک، ہر بھجن میرے ساتھ علیحدگی کے لیے ایک لمحے کے لیے ترستی رہی، لیکن میں نے اسے یہ موقع ہی فراہم نہ کیا۔ ایک دو مرتبہ اس نے جوالا سنگھ کی موجودگی میں بات کرنا چاہی، لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

چاندینو ایئرپورٹ پر ابھی ایئر انڈیا کے بمبئی جانے والے جہاز کی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی تھی کہ ہر بھجن نے مجھے مخاطب کر کے کہا "ویر جی میں نے پیشاب کرنے جانا ہے اور مجھے باتھ روم کا پتا نہیں چلنا، میرے ساتھ چلیں۔"

جوالا سنگھ نے منہ اٹھا کر پوچھا "اور میں؟"

ہر بھجن نے کہا "آپ یہاں بیٹھیں سامان کے پاس۔"

"اوئے رہنے دے سمیان۔" جوالا سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ ولایت ہے یہاں کوئی چوری نہیں کرتا۔"

اتنا کہہ کر وہ ہمارے ساتھ ہو لیا اور ہم ٹائیلٹس کی طرف روانہ ہو گئے۔

OCIETY.COM

۱۳

نظامی صاحب آزاد کشمیر ریڈیو سے تبدیل ہو کر لاہور آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لاہور سٹیشن پر بلوا لیا۔ لاہور سٹیشن کی ایک اپنی ہی شان اور اپنی ہی رعایت تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے زمانے میں بھی اپنے ڈراموں کی وجہ سے یہ سٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا اور اب بھی یہاں نامور لکھنے والوں کی ایک کھیپ موجود تھی۔ ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اپنی کارکردگی کے جوہر دکھانے میں ایک عجیب طرح کا لطف تھا۔ اس وقت بڑوں کی ٹانگ کھینچنے کا رواج نہ تھا۔ ان کے ساتھ پورے اترنے کا چلن تھا۔ بڑے بھی بڑے ہی تھے۔ اچھے کام پر کھل کے داد دیتے اور غیبت میں زیادہ تعریف کرتے۔ ان کی تعریف کا ایک آدھ جملہ جب گھوم پھر کر جونیئر کارکن تک پہنچتا تو زندگی کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ مشکل سے مشکل مرحلہ ایک آسان سی جولاں گاہ بن جاتا اور سفر خوشگوار ہو جاتا۔

ماسٹر باہلی کو میں نے اٹلی سے بھی کئی مرتبہ لکھا تھا اور یہاں آ کر بھی مسلسل لکھتا رہا' لیکن انہوں نے ایک اپنا تازہ فوٹو اور سال نہ فرمایا۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر جاتے' البتہ خط کے آخر میں یہ ضرور لکھتے کہ ایک عدد کیمرے کی بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو ملتا نہیں' اگر تم کہیں سے حاصل کر لو تو میں کسی آتے جاتے کے ہاتھ منگوا لوں۔ اس زمانے میں صرف جرمن کیمرے دستیاب تھے' لیکن بڑے مہنگے تھے۔ میں ایک کوئنا فلیکس اٹلی سے خرید کر لے آیا تھا لیکن اسے اس شرط پر اپنے پاس روک لیا تھا کہ جب تک وہ اپنی تصویر نہیں بھیجیں گے میں کیمرہ نہیں بھجواؤں گا۔ یہ کشمکش بڑی دیر تک جاری رہی۔ بالآخر انہوں نے اپنے خطوں میں اس فرمائش کا تذکرہ ہی بند کر دیا۔

مری سے دوستوں کی فرمائش آئی تھی کہ ہم مل کر نیلم ویلی کی سیر کو جا رہے ہیں' تمہارا اس گروپ میں شامل ہونا ضروری ہی نہیں لازمی ہے۔ فوراً پہنچو اور ساتھ اپنا کیمرہ

بھی لے کر آؤ۔ گروپ لیڈر عمر نے جن چیزوں کے ہمراہ لانے کی فہرست روانہ کی تھی ان میں ایک چھتری' ایک چھتری' ایک عدد تھرموس' بسکٹوں کے پیکٹ' پنیر کا ڈبہ' ہلکی برساتی' فولادی چاقو' کین اوپنر اور ایک مضبوط سی رسی بھی شامل تھی۔ جو چیزیں بہت ہی ضروری تھیں ان کو اس نے انڈر لائن کر دیا تھا۔ میں نے انڈر لائن چیزوں کو چھوڑ کر باقی سب لے لیں اور پنڈی روانہ ہو گیا۔ پنڈی جاتے ہوئے گجرات کے اڈے پر ہماری بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ سپیئر وہیل نہ ہونے کی وجہ سے بس کو جیک پر چڑھا کر اسی پہیے کو پنکچر لگوانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ کلینر نے بتایا کہ ٹیوب ویلکنائز میں چونکہ دیر لگے گی' اس لیے آپ لوگ چائے پئیں اور اخبار پڑھیں۔

سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ڈھابے میں میری کرسی سے دور گھٹے ہوئے جسم والے ایک مولوی صاحب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کی سیاہ گھنی ڈاڑھی' چمکدار چہرے اور سر پر گول کلے کی شہدی لنگی نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ میں اپنی سیٹ چھوڑ کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اپنا کیمرہ کھول کر جب میں نے ان سے ان کی تصویر بنانے کی درخواست کی تو انہوں نے بڑی محبت سے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر میری طرف اپنی پلیٹ بڑھا کر بولے "پہلے میرے ساتھ کھانے میں شرکت فرمایئے پھر تصویر کھنچواؤں گا۔" میں نے ہر چند بھوک نہ ہونے' بے وقت کھانے سے احتراز کرنے اور بازاری کھانے سے گیس پیدا ہونے کے عذر پیش کیے' لیکن انہوں نے میری ایک نہ مانی اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ مجبوراً مجھے ان کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔

کہنے لگے "یہ لاریوں والے بہت تنگ کرتے ہیں۔ ماڈل پرانے ہیں۔ سامان ان کے پاس ہوتا نہیں۔ آدھے راستے بریک ڈاؤن کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور مسافروں کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ آپ کی لاری کا پہیہ پنکچر ہو گیا ہے اور ہماری بس کے کاربریٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اب پتہ نہیں کتنی دیر لگتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

کہنے لگے "میں گجرات کچہری میں عرائض نویس ہوں اور ایک ضروری کاغذ کے حصول کے لیے جہلم جا رہا ہوں۔ میرے سائل کی ضرورت ہے اور اس کو اس بات کا علم نہیں ہے۔ بے چارہ سیدھا آدمی ہے' اس لیے اس کی ڈیوٹی بھگتا رہا ہوں۔ آپ ابھی تک آزاد کشمیر ریڈیو میں ہی ہیں یا تبدیلی ہو گئی؟"

OCIETY.COM

میں ان کا یہ سوال سن کر سکتے میں آ گیا اور لقمہ روک کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔

انہوں نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا "یہ ہوٹل والے مرچیں بہت ڈال دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ مجھے جانتے ہیں؟"

کہنے لگے "اچھی طرح سے۔ میری آپ کی یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ آپ نے بڑے افسر بن کر ہم کو بھلا دیا اور ہم وہیں رہ گئے ٹھن ٹھن گوپال! میں سائیں سنگل شاہ ہوں اور میری آپ کی ملاقاتیں روز ہوتی رہی ہیں۔"

میرے ذہن میں ٹھن ٹھن گوپال کا گھڑیال زور سے بجا اور دیر تک بجتا رہا۔ الیاس صاحب ٹلی کی ہڈی سے چمٹا ہوا گودا نکالنے کے لیے اسے ٹائٹن تھالی میں بجا رہے تھے اور اس کی آواز میری گونج کی لہروں میں شامل ہو رہی تھی۔

میں نے میاؤں سی آواز نکال کر کہا "آپ تو ناتگا پربت چلے گئے تھے؟"

کہنے لگے "او بھائی کہاں کا ناتگا پربت اور کدھر کی دھولی دھار وہ پکڑائی نہیں دیتا' بس ادھر ادھر ہی چھپا رہتا ہے۔ قریب قریب ساتھ ساتھ' کبھی پھول کے پیچھے ہوتا ہے' کبھی پھل کے پیچھے۔ کبھی رنگ کی اوٹ میں کبھی لے کے پیچھے۔ آدمی نے پھول سونگھ لیا' پھول توڑ لیا رنگ لے لیا' لے سن لی اور خوش ہو گیا۔ اس کے پیچھے نہ دیکھا اور رکاوٹ عبور کی۔ میں کیا کرتا' میں بھی تو آدمی تھا۔ سنگلوں کا بوجھ اٹھائے پھرا اور سنگل کے پیچھے نہ دیکھا۔

پہاڑ چھوڑ کر محمد الیاس سنگل شاہ گجرات آ گیا اور کنجاہ کے راستے پر ایک جھگی ڈال کر اس میں رہنے لگا۔ شدہ شدہ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور لوگ منتیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے اس کے ڈیرے پر آنے لگے۔ بڑے بڑے سردار دو شملوں کی پگڑیاں باندھے جب اس کی جھگی کے سامنے سے گزرتے تو اپنے گھوڑوں سے اتر کر پیدل چلنے لگتے۔ وہ ان کو اونچی آواز میں گالیاں اور کوسنے دیتا اور سردار دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کرتے وہاں سے گزر جاتے۔ کسان اور ہالی ہر روز ٹھنڈے پانی کے گھڑے قطار اندر قطار اس کی جھگی کے باہر سجا جاتے۔ راہ گیر ذرا دیر کو رک کر ٹھنڈا پانی پیتے' گالیاں سنتے' روڑے کھاتے اور مسکراتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے۔ عورت کو وہاں آنے کا حکم نہیں تھا اور یہ بات عام مشہور تھی کہ جو عورت سنگل شاہ کی جھگی سے دس قدم کے فاصلے پر گزرے گی وہ بھسم ہو کر سلیٹی راکھ میں تبدیل ہو جائے گی۔ عورتیں اپنے پراندے کی

ڈوری میں تین گانٹھیں دے کر اسے آٹے کے پیڑے میں لپیٹ کر اپنے مردوں کے حوالے کر دیتیں جو وہاں سے گزرتے ہوئے آٹے کا پیڑا جھگی کے آگے پھینک کر گزر جاتے اور ان کی سوائنوں کی مرادیں پوری ہو جاتیں۔

سنگل شاہ عشق حقیقی کی پہلی منزل میں داخل ہو چکا تھا اور اس کی ملاقات ان ارواح سے ہو گئی تھی جو اپنی ابتدائی منزل کا سفر پورا کر کے آگے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ جس روح کو اذن مل جاتا' وہ آگے جانے کے لیے منزل کی آخری سرحد پر پہنچ جاتی اور دوسری روحیں اس کے گرد جمع ہو جاتیں۔ وداع کا یہ منظر بہت ہی دلدوز اور کربناک ہوتا۔ پیچھے رہ جانے والی روحیں آہ و بکا اور نالہ و شیون کرتیں۔ جانے والی روح کے قدموں سے چمٹ جاتیں اور اپنی اپنی سفارش پیلی پیلی پتیوں کے نقوش پر ابھار کر اس کے قدموں سے چسپاں کرتی رہتیں۔ کچھ پتیاں چمٹنے سے انکار کر دیتیں۔ کچھ چمٹ جانے کے بعد سوکھ کر الگ ہو جاتیں اور جو دو چار لگی رہ جاتیں وہ روح کی روانگی کے وقت اکھڑ کر پہلی منزل کی نیلی دھول میں گر جاتیں۔ اس وقت کی نالہ و زاری کا سماں عجیب ہوتا۔ منزل پر جانے والے بھی روتے اور منزل سے چلنے والے بھی فراق کی کلفت میں آہ و وداع کی سسکاریوں میں ڈوب جاتے۔

جس روز سنگل شاہ کو اگلی منزل پر جانے کا اذن ملا اس کے وجود میں پہلی مرتبہ پریم کی امرت دھارا حلق سے ناف تک اتر گئی۔ گالیوں کا وہ پشتارا جس کی ایک گانٹھ ابھی تک اس کے پردے میں چھپی پڑی تھی' ایک فیتے کی طرح خود بخود کھلی اور کنول کا پھول بن گئی۔ پھر اس پھول کے نیچے جوہڑ کا گدلا پانی صاف ہونے لگا اور دیکھتے دیکھتے نیلے جل میں تبدیل ہو گیا۔ اس نیلے پانی میں چھوٹی چھوٹی روپہلی مچھلیاں کنول کے گرد طواف کرنے لگیں اور اپنے گلپھڑوں سے حق ہو کے جلترنگ بجاتی ایک کورس میں ورد کرنے لگیں۔

آدھی رات کے وقت جب سنگل شاہ اپنی کٹیا میں سویا ہوا تھا اور اس کی اگلی منزل پر روانہ ہونے کے لیے دوسری روحیں مقام وداع پر جمع ہو رہی تھیں' ہیولو لوہاری اس کی کٹیا میں داخل ہوئی اور اس کے زنجیر پوش بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پھر اس نے اٹھ کر آہستہ آہستہ سائیں الیاس کے سارے سنگل کھولے اور نیچے سے اس کا رنجور چنڈا نکال کر اس پر محبت کا ہاتھ پھیرا۔ سنگلوں کی سختی کے بعد ایک نرم ہاتھ کے لمس نے جلد کے سارے روئیں ایک ساتھ کھڑے کر دیئے۔ آہنی انڈے کے خول سے ایک نرم و نازک چوزہ برآمد ہوا اور اس نے اپنے آپ کو ہیولو لوہاری کے پروں میں چھپا لیا۔

OCIETY.COM

ادھر مقام وداع پر روحیں بڑی دیر تک انتظار کرتی رہیں۔

میں نے کہا "ببو لوہاری اب کہاں ہے؟"

کہنے لگے "گھر پر ہے اور اصرار کر رہی تھی کہ کھانا کھا کر جاؤ لیکن میری قسمت میں یہ مرچوں والا سالن لکھا تھا۔ یہ ہوٹل والے خالی مرچیں ہی نہیں ڈالتے ہلدی بھی بہت زیادہ ڈال دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور ببو کا خاوند کہاں ہے؟"

بولے "اس بے چارے کو تپ دق ہو گئی تھی۔ ہوتی کیوں ناں! سارا دن تو سینہ ننگا کر کے بھٹی کے سامنے بیٹھا رہتا تھا۔ تاؤ لگ گیا اور دونوں پھیپھڑے گل گئے۔"

"مر گیا؟" میں نے پوچھا تو انہوں نے درد بھرے لہجے میں کہا "مرا تو نہیں البتہ گاؤں چھوڑ گیا ہے۔ کچھ دیر تو داتا دربار کے فقیروں میں شامل رہا اب سنتے ہیں سندھ کی طرف نکل گیا ہے اور کسی چھوٹی سی درگاہ پر فقیری کر کے اپنا وقت گزار رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کبھی اس سے ملے؟"

کہنے لگے "ببو کا کاغذ لینے کے لیے دو تین مرتبہ اس سے ملا تھا۔ انگوٹھا لگاتے وقت دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تو میرے بھی آنسو نکل آئے۔"

میں نے الیاس محمد عرائض نویس کے تین فوٹو اتارے۔ دو پروفیل اور ایک فرنٹ پوز۔ شٹر کی آواز سن کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگے "بڑا کھڑاک ہے۔"

میں نے کہا "یہ قیمتی کوئنا فلیکس ہے اور جرمن کیمرہ ہے۔ اسے میں نے اپنے استاد کے لیے اٹلی سے خریدا تھا اور سب سے پہلے اس سے آپ ہی کی تصویر بنائی ہے۔"

سب سے پہلے والی صف میں آنے پر الیاس بہت خوش ہوئے اور ڈاڑھی کھجا کر بولے "یہاں کی کھیر بہت اچھی ہے ایک پلیٹ منگواؤں۔"

میں نے کہا "پہلے ہی بہت کچھ ٹھونس لیا ہے اب گنجائش نہیں رہی۔ پھر کبھی موقع ملا تو کھیر بھی کھا لیں گے۔"

جب میں پنڈی کے بس سٹینڈ پر اترا تو میرا کیمرہ چوری ہو چکا تھا اور میرے کندھے پر صرف ایک بیگ رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ کٹے ہوئے کیمرے کا چرمی سٹیپ لٹک رہا تھا۔

WWW.PAKS

۱۴

میری شادی پر ماسٹر باقی نے ایک بڑے سے لفافے میں موتیے کا ہار رکھ کر بھیجا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ دلہن اس کو اپنے ہاتھ سے نہ پہنے' ساس پہنائے یا نند پہنائے' مرد ہاتھ نہ لگائے۔ لفافہ کھولنے پر میرا ہاتھ تو لگ چکا تھا' لیکن میں نے ہار کو اسی طرح لفافے میں ڈال کر اماں کو دے دیا اور ساتھ ہی ہدایات بھی دے دیں۔ اسی خط میں استاد صاحب نے مجھ سے بانو کا فوٹو بھی مانگا تھا' لیکن میں نے جواب میں لکھ دیا کہ جب تک آپ اپنی تصویر نہیں بھیجیں گے آپ کو فوٹو نہیں بھیجوں گا۔ تصویر اور فوٹو کا جھگڑا بڑی دیر تک چلتا رہا اور ہم دونوں اپنی اپنی ضد پر قائم رہے۔

ماسٹر صاحب کے خطوں سے مجھے توحید کی سکھشا تو ملتی ہی تھی' اب کچھ کچھ اشارے مارکسزم کے بھی ملنے لگے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دھارمک مواد کے ساتھ ساتھ انہوں نے مارکسزم کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے اور اس فلسفے کو ایک نظریے کے طور پر اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ سوشلزم اور مارکسزم کو وہ روحانیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے اور موج میں آکر عجیب و غریب باتیں لکھ جاتے تھے۔ میں نے ان کو کئی مرتبہ لکھا کہ میرا اس فلسفے پر ایمان نہیں ہے کہ اس کے بانی نے مذہب کو عوام کی افیون قرار دیا ہے لیکن وہ اپنے خطوں میں اور شد و مد کے ساتھ "مذہب"، "افیون" اور "عوام" کے باہمی رشتوں کا ذکر کرنے لگے اور ایک ایک پر دس دس صفحے کے تھیسس روانہ کرنے لگے۔ ان کے ایسے خطوں سے میری طبیعت اوبنے لگی اور میں نے ان کی تحریروں کو بغیر پڑھے سینت سینت کر رکھنا شروع کر دیا۔

گیانی ہونے کے رشتے اور مذہبی فلسفوں کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے ان کی تحریر میں بڑا نکھار آگیا تھا اور جچی تلی بات کہنے کا ڈھنگ سیکھ گئے تھے۔ میں نے اپنی ضد اور تعصب کے باوصف ان کے خطوں میں ایسی باریک باتوں کے عقدے کھلے دیکھے کہ اگر میری جگہ کوئی

OCIETY.COM

اور ہوتا تو یقیناً ایک سوشلسٹ سکھ بن جاتا۔

6 ستمبر کی صبح میری بیوی نے گھبراہٹ کے عالم میں مجھے جھنجھوڑ کر کہا "جلدی اٹھیے۔ ہندوستان نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔"

"لاہور پر!" میں نے ہڑبڑا کر پوچھا "لاہور پر!"

"ابھی ابھی ریڈیو سٹیشن سے فون آیا ہے۔" اس نے کہا "اور انہوں نے یہ خبر دے کر کہا ہے کہ آپ اسی وقت اسی حالت میں فوراً ریڈیو سٹیشن پہنچ جائیے۔"

ریڈیو سٹیشن پر شادی کا سماں تھا اور ہر شخص لڑکی والوں کی طرح بارات کا کارندہ بنا ہوا تھا۔ ریہرسل روم میں ترانوں کے کورس تیار ہو رہے تھے۔ ریکارڈنگ روم کے اندر گانے والوں کا جمگھٹا تھا۔ ڈیوٹی روم میں کھلی تاریں پھینک کر پرانی وضع کا ایک نیا ٹیلی فون لگا ہوا تھا جو بلاواسطہ طور پر ایریا ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ملا تھا۔ ہر شخص آگے پیچھے اوپر نیچے بھاگا پھرتا تھا اور ہیڈ کوارٹر سے دس دس منٹ بعد خبروں کا بلیٹن نشر ہو رہا تھا۔ لاہور کے شاعر اور ادیب ڈیوٹی روم کے باہر جمع تھے اور اپنی اپنی تحریروں پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ پرانے پرانے بڈھے اور لنگڑے لولے صداکار پتہ نہیں کدھر سے آکر گراسی پلاٹ میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ اونچے اونچے نعرے مار رہے تھے اور اپنے کمزور سینوں پر ہاتھوں کے دھموکے مار مار کر منحنی بدنوں کو لرزا رہے تھے۔

بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ صدر ایوب جلد ہی قوم سے خطاب کرنے والے ہیں اور بزدل دشمن کے چوروں کی طرح ہماری سرحدوں میں گھس آنے پر ایک باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دفاعِ وطن کا حکم دینے والے ہیں۔ سڑکوں پر، بازاروں میں اور گلیوں محلوں کے اندر ایک میلے کا سماں تھا۔ فوجی قافلوں کو راہ دینے کے لیے عام ٹریفک سڑکوں کے کناروں سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور راستوں میں لوگوں کی ٹولیاں آرمی کے ٹرک روک کر فوجیوں کو سگریٹوں، بسکٹوں اور دیا سلائیوں اور مٹھائیوں کے پیکٹ دے رہے تھے۔ قصور کے کانوائے روٹ پر لوگ نان کباب اور پلاؤ کی دیگوں کے ریڑے لے کر پہنچ گئے تھے، جس کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے گھر میں نہیں رکھا تھا کانوائے روٹ پر لے آیا تھا۔

شام کے پانچ بجے دیہاتی پروگرام سے ذرا پہلے لاہور سٹیشن سے جب میڈم نور جہاں کا ترانہ "اے وطن کے سجیلے جوانو" فضا میں بلند ہوا تو جوانوں نے کھیم کرن پر گولہ باری شروع کر دی۔ سلیمانکی کے اندر گھس گئے اور گنڈا سنگھ کے پل پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان کو پاکستان

WWW.PAKS

جیسے حقیر کیڑے سے ایسے جارحانہ جواب کی توقع نہ تھی۔ اس کی پیش قدمی رکنے لگی اور وہ پہلی رات جہاں تک پہنچا تھا وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

پینسٹھ کی جنگ میں سکرپٹ نویسی کے ساتھ مجھے مائیک پر بھی آنا پڑ گیا۔ تاج' نور' محمد حسین اور امیر خان جیسے لوگوں کی صحبت میں رہنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مائیک پر جاتے وقت نہ تو میں گھبرایا اور نہ ہی مجھے ایک مخصوص لہجہ بنانے میں کوئی دقت پیش آئی۔

پروگرام چلا اور خوب چلا۔ فوجی خندقوں سے مبارکباد کے پیغام وصول ہونے لگے اور شہر کے لوگوں نے ڈیوٹی روم فون کرنے شروع کر دیے کہ ہم "شاہ جی" سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا یہ پروگرام اپنے استاد سے رابطے کا ایک ذریعہ بھی بن گیا' لیکن یہ رابطہ یک طرفہ تھا۔ وہ تو میری آواز سن لیتے تھے لیکن ان کے درد بھرے سروں کو سننے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جنگ کی وجہ سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ میں نے اٹلی میں پروفیسر باؤسانی کے خط میں ماسٹر بالی کے نام کا ایک لفافہ ڈال دیا کہ ٹکٹیں لگا کر انہیں پوسٹ کر دیا جائے اور جب ان کا جواب آئے تو اٹلی سے میرے نام روانہ کر دیا جائے۔

استاد مکرم نے اس رابطے کو بہت پسند کیا اور اپنے پہلے ہی خط میں مجھے لکھا کہ شام کے وقت تمہاری آواز ہر روز سننے کو مل جاتی ہے۔ تم نے تو اپنی لے میں بڑا کمال پیدا کر لیا ہے اور جو باتیں تم کہتے ہو وہ تمہاری لے سے بھی زیادہ وزن دار ہوتی ہیں۔ اس سلسلے کو ختم نہ کرنا اور حالات ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی جاری رکھنا۔ اس میں بڑی جان ہے اور یہاں کے لوگ باقاعدگی سے یہ پروگرام سنتے ہیں۔

آگے پوچھا تھا کہ تم کو یہ خیال کیسے آیا اور تم نے سنام کے بھلوار سنگھ کی آواز کیسے نکالی۔ یہاں تو تم نے کبھی اس صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا' پھر پاکستان پہنچ کر ایک دم سے صداکار کیسے بن گئے۔ ماسٹر نند کشور اگر وال کہتے ہیں کہ تم نے کہانیوں کی ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں داؤ چنت رام کی کہانی درج ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ تم نے ایسی کوئی کہانی لکھی ہے اور کیا داؤ جی کو پتا تھا کہ تم نے ان کا حال احوال درج کر کے اپنے استاد کا مان بڑھایا تھا۔ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن میں نے ان کے لڑکے امی چند سے پوچھا تھا۔ وہ اس کہانی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بھی ایک طرح سے تمہارا استاد ہی ہوں۔ گو اتنا مہاپرش نہیں جتنے داؤ جی تھے۔ لیکن اگر مجھ پر کوئی کہانی لکھنا تو مجھے بتا ضرور دینا' میں اسے پڑھے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ آگے انہوں نے میری لیاقت اور قابلیت کے طول و طویل

OCIETY.COM

تعریف کے پل باندھے تھے۔ جن کے ساتھ ہلکی سی لکیر اس تفاخر کی بھی چلتی تھی کہ میرے کسی ایک شاگرد کو تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ سو ایک نکل آیا۔

پینسٹھ کی جنگ کے دوران تو ہم بڑے خوش و خرم اور حوصلہ مند رہے' لیکن معاہدۂ تاشقند کے بعد ہمارے حوصلے کی طنابیں کاٹ دی گئیں اور ہمارے دل بجھ گئے۔ وہ جو سب کچھ اس قدر جوش اور ولولے کے ساتھ کیا تھا اور جس کارکردگی پر اتنا ناز تھا بے معنی سی ہو کر رہ گئی۔ ہندوستان ایک پدے سے حریف سے مار کھانے اور شرمندگی کے گڑھے میں اتر جانے کے بعد اچانک ایک صحت مند ملک کے روپ میں ابھرا' اور ساری دنیا سے داد حاصل کرنے لگا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بھٹو صاحب نے وعدہ کیا کہ وقت آنے پر وہ اس راز سے پردہ اٹھائیں گے اور عوام کو حقیقت حال سے آگاہ کریں گے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا اور ہم سب گوش بر آواز اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ اب اس راز سے پردہ اٹھے گا مگر ایسا نہ ہو سکا اور یہ راز' راز ہی رہا۔

ریڈیو کی رنگین اور پر کیف زندگی سے علیحدہ ہو کر میں بورڈ میں آ گیا اور کتابیں شائع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ بورڈ کی زندگی تھکانے اور اکتا دینے والی تھی۔ اس میں کوئی لطف نہ تھا نہ ہی کوئی بڑا چیلنج سامنے تھا جو کہ بورڈ کے ارکان طے کر دیتے اسے پورا کرنا پڑتا اور جس کام کا وہ حکم دے دیتے اسے طوعاً و کرہاً بجالانا ہوتا۔ اس ملازمت کے دوران ایک اور ہی طرح کے گروہ سے پالا پڑا۔ یہ گروہ ریڈیو کے لوگوں کی طرح ذہین اور روشن فکر تو نہ تھا' البتہ طاقتور اور منہ زور بہت تھا۔ اس کے حکومت وقت کے ساتھ نزدیکی تعلقات قائم تھے اور یہ ہر کام بھی اسی ایک حوالے سے کرتا تھا۔ اس کے ایک ایک فرد کو بڑی مراعات حاصل تھیں اور ان کی حضوری میں میری حالت جاگیردار کے سامنے اس مزارع کی سی تھی جس کی بہت سی بیٹیاں ہوں اور جس کی زندگی کا دارومدار محض سرداروں کی خوشنودی پر ہو۔ اس گروہ نے مجھے دھودھا کر اور پاک صاف کر کے الگنی پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا اور میں آتے جاتے موسموں کی ہواؤں میں سوکھ کر ایک ایسا پارچہ بن گیا جس سے موٹریں صاف کی جاتی ہیں اور جسے نچوڑ کر پھر سوکھنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

ماسٹر بالی کے خط مجھے اب بھی ملتے تھے لیکن ان میں وہ چاشنی نہیں رہی تھی۔ محبت اور تعلق کی چڑیا اڑ گئی تھی اور اب ایک خالی سا گھونسلا رہ گیا تھا جسے نہ پھینکا جا سکتا تھا نہ رکھا جا سکتا تھا۔

WWW.PAK

استاد مکرم اپنے خطوں میں جس قدر گرمجوشی کا اظہار کرتے اسی نسبت سے لاتعلقی کا خلا بسیط ہوتا جاتا۔ ان سے ملنے کی ایک موہوم سی آرزو البتہ باقی تھی' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی ماند پڑ رہی تھی۔ رشتے ناتے کنکریٹ کی طرح مضبوط اور پلوں کی طرح پائیدار نہیں ہوتے۔ ان کے ختم ہو جانے کی زیادہ سے زیادہ قیمت ایک نوحہ یا ایک مرثیہ ہوتی ہے۔ بہت مضبوط ہوئے تو ختم ہونے کے بعد چند گلے اور کچھ شکوے باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور زندگی کی گاڑی واپس اپنے موومینٹم پر پہنچ جاتی ہے اور اس وقت تک اسی رفتار سے چلتی رہتی ہے جب تک زندگی کا اپنا آخری سٹیشن نہ آ جائے۔

ماسٹر صاحب زندگی کی ساری احتیاطی تدابیر کو اور جہد مسلسل کو کھیل تماشے کا نام دیتے تھے۔ ان کو نہ کھیل سے دلچسپی تھی نہ تماشے سے۔ نہ دیکھنے سے نہ اپنا آپ دکھانے سے۔ نہ روٹھنے سے نہ منانے سے پھر بھی وہ کھیل تماشے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے لیے بارات کی آمد اور جنازے کی روانگی ایک سے تقدس کے حامل تھے۔ وہ کامیابی اور ناکامی کی ماں بیٹی کے بے آسرا گھرانے کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اپنی زکوٰۃ اور صدقے کی ساری رقم ان پر خرچ کرتے تھے۔ لیکن مجھ سا باعمل اور روشن خیال انسان جو اپنی ایگو کے خول سے باہر نکلنے کو رہبانیت گردانتا ہے' اس راہب سے متاثر ضرور تھا۔ گرمجوشی کم ہونے کے باوصف ہمارے درمیان بندھی ہوئی ڈور کھنچ کر باریک ضرور ہو گئی لیکن ٹوٹ نہ سکی۔

OCIETY.COM

۱۵

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی برسی پر سکھ یاتریوں کا جو قافلہ ہندوستان سے آیا اس میں بھائی کرپال سنگھ جتھے دار بھی تھے۔ مجھ سے ملنے بورڈ کے دفتر آئے تو ہم نے گھٹ کر ایک دوسرے کو جپھی ڈال لی اور دیر تک جدا نہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دو اور سکھ بھی تھے جو ہمارے اس قریبی تعلق کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ میں نے بھائی کرپال سنگھ کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا "بائی تو تو بالکل بوڑھا ہو گیا۔"

انہوں نے ہنس کر کہا "اپنی شکل نہیں دیکھتا جو ایک زمانے میں کلو کا سیب تھی اب پپیتے کی طرح بے ڈھبی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "بائی تیری تو ڈاڑھی بھی آدھی سفید ہو گئی۔"

کہنے لگے "تو ڈاڑھی رکھ لے اگر ساری سفید نہ نکلے تو میرا نام بتا دینا۔"

دوسرے دونوں سکھ ہنسنے لگے تو میں نے بے بے جی' باپو جی' کلدیپ سنگھ اور چھوٹی بی بی کی بابت پوچھا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "سب راضی باضی' سکھ ساند' رب سچے کی مہربانی' واہگورو کی کرپا۔"

میں نے کہا "کلدیپ تو سنا ہے ولایت چلا گیا تھا؟"

کہنے لگے "ماں باپ کا لاڈلا' سب سے چھوٹا ویر' مرضی کا مالک' سٹھ ہزار روپیہ اجاڑ کے واپس آ گیا۔"

"کوئی میم وغیرہ تو نہیں لے آیا وہاں سے۔" میں نے پوچھا۔

"میم کی سن لو" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "باپو جی کو تو اس کی چٹھیاں دکھاتا رہا۔ بے بے کو تصویریں دکھا کر ڈراتا رہا کہ سوموار آ رہی ہے' بدھ وار آ رہی ہے' دونوں ہی اس کور شوتیں وڈھیاں دیتے رہے کہ ناں کاکا ادھر نہ بلائیں' سارے شہر کی بدنامی ہو گی۔ ملنا ہو تو

ایک بار پھر ادھر ہی چلے جانا' ہم بھاڑا دے دیں گے۔"

"اور آپ نے کچھ نہیں کیا؟"

"میں کیا کرتا بھائی میرے۔ لاڈلا بیٹا' سب سے چھوٹا' اوپر سے سوہنا میں نے بھی کہہ دیا کہ ادھر منگوائی ہو تو ادھر منگوا لے' مجھے کوئی اعتراض نہیں' دوبارہ ولیت جانا ہو دے تو خرچہ بھاڑا میرے سے لے لے بڈھے بابیاں کو تنگ نہ کر۔"

"بڑا سیانا ہے۔" بھائی کرپال سنگھ کے ایک ساتھی نے کہا "مہاجنوں کی طرح بیں لکھ کر سو پر انگوٹھا لگوا لیتا ہے۔"

"لاڈلا ہے بھئی لاڈلا۔" دوسرا بولا "جو بڑے دیر بھرا کا لاڈلا ہو اس کی تو چاروں طرف کہا وہی کہا وہ ہے' چاہے کھڑے کھیت کا سودا کر لے چاہے منڈی بھیج دے۔"

"او بھائی کیا بڑا بھرا اور کیا اس کی اوقات۔ واہگورو نے موج بہار رکھی ہے۔" کرپال سنگھ نے کہا "سورت جیسا کلدیپ سنگھ ہمارے گھر پیدا کر دیا' بے پرواکی بے پروایاں ہیں۔ اس کا کون سانا نواں لگتا ہے چاہے جتی سے ہیر بنا دے۔" پھر میری طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگے "سارے تخت پور میں دھوم پڑی ہوئی ہے کہ کوئی بڑا افسر بن گیا ہے' کوٹھی بنگلہ گاڑی ساتھ سرکاری ملازم۔ سنا ہے بی بی بھی بڑی تعلیم یافتہ ہے' کتابیں لکھتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ اس سے مل کر معلوم کر لیجئے گا کہ کس قدر تعلیم یافتہ ہے۔ اس وقت گھر چلتے ہیں اور وہیں کھانا کھاتے ہیں۔"

کہنے لگے "یہ اپنے سردار سوبھا سنگھ تو ماس کھا لیتے ہیں پر بھائی ہردت سنگھ ویجی ٹیرین ہیں۔"

بھائی ہردت سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "کوئی بات نہیں آپاں سوکھی روٹی چینی کے ساتھ کھا لیں گے۔ بہت ہوا تو دہی منگوا لیں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

میں نے شریف الدین کو اندر فون اٹھا کر کہا "بانو کو بتا دیجئے کہ صاحب کے ساتھ تین مہمان بھی آ رہے ہیں' جن میں سے ایک ویجی ٹیرین ہیں' کوئی آدھ گھنٹہ تک پہنچ جائیں گے۔"

سوبھا سنگھ نے ہردت سنگھ کو بتلایا "اندر پی اے کو فون کیا ہے وہ آگے خود ہی بتا دے گا۔"

میں نے پی اے کو فون بھی اپنی افسری دکھانے کے لیے کیا تھا اور اپنے لیے "صاحب" کا لفظ بھی شان بڑھانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ان تینوں پر دھاک بیٹھ گئی اور بائی کرپال سنگھ

OCIETY.COM

نے باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر خاموش زبان میں پوچھا "دیکھا پھر! کیسے بڑے بڑے لوگوں سے ہمارے تعلقات ہیں اور کیسے بڑے بڑے لوگ ہمیں کھانے پر مدعو کرتے ہیں۔"

کھانے تک کا وقت گزارنے کے لیے میں نے بائی کرپال سے تخت پور کی خبریں پوچھنا شروع کر دیں جن کے نشریے میں ان کے ساتھی بھی شریک ہو گئے۔

میں نے کہا "بائی وہ آپ کی پتی' میں ایک جانکی چماری ہوتی تھی' شہر سے دور جھگی میں!"

ہردت نے کہا "وہ تو جب ہی مر گئی تھی' پلے گلے کے دنوں میں' پتہ نہیں سپ لڑ گیا تھا یا ہلکایا کتا کاٹ گیا تھا۔ جھگی کے اندر ہی مر گئی تھی۔"

"نہ سپ لڑا تھا' نہ ہلکایا کتا بڈھیا تھا۔ کوئی چیز کھالی تھی اس نے زہریلی۔" بھائی کرپال سنگھ نے کہا "دو دن تک اپنی جھگی میں پڑی رہی۔ جب بدبو آنے لگی تو لوگوں کو پتہ چلا۔ اب ناں تو کوئی اسے ساڑنے پر تیار تھا نہ پھونکنے پر۔ باپو جی نے چماروں کے بسرام جا کر اطلاع دی تو وہ بھی ہاتھ لگانے سے انکاری ہو گئے کہ ہماری گوت برادری نہیں ہم نہیں پھونکتے۔"

"پھر کمیٹی والوں نے اس کی ٹانگ میں رسی ڈال کر گھسیٹا اور کالووال کی نیائیوں میں لے جا کر دبا دیا۔" ہردت نے کہا "پتہ نہیں کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا سے وہیں دیکھا اسی جھگی میں۔"

میں نے کہا "اور مودن پانڈی کا کیا حال ہے؟"

کہنے لگے "بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس وقت سو سے اوپر ہو گا' اب بھی منڈی میں بوریاں اٹھاتا ہے اور اسی طرح جھگڑتا ہے۔ تھوڑا سا دماغ مل گیا ہے' عورت مرد میں فرق نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "ایک جانوں کلیسر تھا جو گیس پلانٹ کی لاریوں میں سیخ مارا کرتا تھا..... وہ؟"

بھائی کرپال سنگھ نے کہا "جانوں کون سا' مجھے تو یاد نہیں؟"

سوبھا سنگھ نے کہا "حد کرتے ہو ویر جی' آپ کو جانوں یاد نہیں۔ لمبے لمبے بودوں والا' جانوں کالیا' جو مرزا صاحباں کی ہیک لگایا کرتا تھا۔"

"اچھا اچھا جانوں کالیا" بھائی کرپال سنگھ نے کہا "وہ جو رنتی چوہڑی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔"

"بالکل' بالکل" میں نے سر ہلا کر کہا۔ "وہی جو لیلیٰ اچیاں مندراں والیے پادے خیر فقیراں نوں گایا کرتا تھا۔"

کہنے لگے "اس کو تو تیرے ہوتے ہوئے قید ہو گئی تھی چھ مہینے کی۔ پھر وہ پانچ سال اور جیل میں رہا۔ اب پتہ نہیں۔"

میں نے کہا "چھ مہینے کی قید ہو گئی تھی تو وہ پانچ سال جیل میں کیسے رہا؟"

سوبھا سنگھ نے ہنس کر کہا "وہ ماں کا یار بھی عجیب آدمی تھا۔ چھ مہینے کی قید کاٹ کر جس دن رہا ہوا تو جیل کے پاس ٹیلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ شام کو جب ملزموں کی لاری انہیں کچہری سے پیشی بھگتا کر واپس جیل لائی تو یہ سالا پھر ان میں رل مل کر جیل کے اندر داخل ہو گیا۔ پورے تین سال تک جیل کے اندر مفت کی روٹیاں کھاتا رہا۔ جس دن پتہ چلا تو ہتھکڑی اور بیڑی ڈال کر سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ہیرن صاحب تھا تو اینگلو انڈین پر تھا دولہا آدمی۔ جب جانوں نے اسے بتایا کہ باہر تو دھکے ہی دھکے ہیں اندر آرام ہے تو ہیرن صاحب بہت ہنسا اور اس نے وارڈن کو حکم دے دیا کہ جانو کو اندر ہی رہنے دیا جائے اور اس سے مشقت بھی نہ لی جائے۔ دو سال بعد جب ہیرن صاحب کی تبدیلی ہو گئی تو جانوں کو بھی مجبوراً رہا ہونا پڑا۔ اب پتہ نہیں کہاں ہے' واپس تخت پور تو نہیں آیا۔"

میں نے کہا "اور ایک پنڈت شیودرام ہوتا تھا' اولی والی گلی میں جو ہر وقت داتن ہی کرتا رہتا تھا؟"

"وہ بے چارہ تو پھاہا لے کر مر گیا تھا۔" ہردت سنگھ نے کہا۔ "پڑوس کے لڑکوں سے کوئی جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے مل کر پھینٹی لگائی۔ چھوٹی سی دیہہ اور چھوٹی سی جان بے عزتی نہ سہار سکی۔ پرانے کیکر کے درخت میں رسہ ڈال کر پھانسی لے لی اور نہر میں ڈوب کر مر گیا۔"

میں ہنسا تو بھائی کرپال سنگھ نے سنجیدگی سے کہا "ہردت ٹھیک کہتا ہے۔ اپنے علاقے سے کوئی دو ڈھائی میل دور اودے کرن کے پل میں اس کی لاش پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے تو اور دور نکل جانا تھا اگر ڈالا پل میں نہ پھنستا۔"

"ڈالا!" میں نے حیران ہو کر پوچھا تو سوبھا سنگھ جی کہنے لگے "وجود تھا اس کا چھوٹا اور غصہ تھا اس میں زیادہ۔ گلے میں پھندا ڈال کر زور کا جھٹکا جو مارا تو ڈالا ٹوٹ گیا۔ دونوں نہر میں جا گرے۔ پھندا لگا رہا اور ڈالا شیودرام کو کھینچتا ہوا اودے کرن کے پل تک لے گیا۔ اصل میں وہ پھندا لگنے سے نہیں مرا ڈوب کے مرا ہے۔"

ہردت سنگھ نے کہا "ناں سردار جی' مرا پھندا لگنے سے ہی ہے۔ پانی تو اس کے پیٹ میں